جنت نہ ملے گی دوبارہ

جنت وہ واحد شاندار جگہ ہے، جہاں جانا تو سب چاہتے ہیں مگر جلدی کسی کو نہیں۔ بھئی اچھی جگہ تو جلدی جانا چاہیے۔ ایسی کھلی باتیں کرنے والے، امتیاز احمد اردو کے ہمارے پروفیسر ہوا کرتے تھے۔ وہ ایک حقیقی اُردو دان شخص تھے۔ الفاظ کی ادائیگی میں روانی اور تلفظ پر سو فیصد کمال کا کنٹرول تھا۔ اُردو زبان کے عالم تھے، ہمیں تو یہی محسوس ہوتا تھا کہ اُردو کے تمام لکھنے والوں کی شاعری اور نثر کو گھوٹ کر پیا ہوا ہے۔ شعروں غزلوں نظموں کی تشریحات بالکل نئے انمول انداز میں پیش کیا کرتے تھے۔ اپنے لیکچر کے درمیان متعلقہ لطیفے اور ظرافت کے بیان میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ایک دفعہ ایک غزل کی تشریح میں کہنے لگے، شاعر کا اس غزل میں یہ کہنا ہے۔ جنت ادھر ہی بنانی پڑے گی، کہیں اور نہیں ملے گی۔ کیونکہ دوزخ تو ہر جگہ موجود ہے، اس دوزخ سے جنت کو اپنے لیے نکالنا پڑتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح بیماری تو ایک مستقل چیز ہے، اس میں صحت کا کچھ حصہ نکالنا پڑتا ہے۔ جو زیادہ اپنی جان کی حفاظت کرے گا، وہ لمبا عرصہ چلے گا۔ ورنہ بیماری تو اُسے اس جہاں سے لے جانے کیلئے ہر وقت تیار کھڑی ہوتی ہے۔ یہ دُنیا ایک جہنم کدہ ہے، لیکن اسکو جنت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اس دُنیا کے بے شمار ممالک نے جہنم سے جنت تک کا سفر کامیابی سے طے کیا ہے اور کرتے جارہے ہیں۔ وہ مرنے کے بعد جنت دوزخ کے کانسپٹ کو مسترد کرتے تھے۔ پروفیسر صاحب کی سوچ کا کمال یہ تھا، وہ ہمیشہ تیسرے یا چھوتے زاویہ سے ہر معاملے کے بارہ میں اپنی آرا رکھتے تھے، جو بے حد پُر لطیفل اور دور بین نگاہ ہوتی تھی۔ میں ان کا پیریڈ کبھی مس نہیں کرتا تھا۔ ویسے تو اُن کا روزانہ کا پیریڈ ہی ایک محفل کی طرح ہوتا تھا۔ لیکن مہینہ میں ایک یا دو بار صرف اور صرف لطیفوں اور کہاوتوں کی کلاس ہوتی تھی، کوئی نصاب کی بات نہیں ہوتی تھی۔ ہر کسی کو باری باری موقع دیتے کہ وہ اپنا لطیفہ یا گانا یا پھر کوئی کہاوت، دوسے

تین منٹ میں سُنائے۔ ساتھ تنبہ کرتے کہ لطیفے پر ہنسی آنی چاہیے، سنانے والے پر نہیں۔ پروفیسر صاحب کا شبیہہ اور قد کاٹھ قائداعظم سے کافی ملتا تھا۔ ہم اپس میں اُنہیں قائد ثانی کے نام سے پکارتے تھے۔ عمومی طور پر سوٹ (پینٹ کوٹ) پہنتے کبھی کبھی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنتے اور بہت سمارٹ شخص تھے۔ قریش پور، جون ایلیا، حمایت علی شاعر وغیرہ کے بہت قریبی دوستوں میں سے تھے اُن کے بارہ میں لکھنے کا مقصد صرف یہ ہے، کہ کراچی کا کلچر بہت وسیع القب، برداشت، اور بہت ماڈرن خیالات کا تھا۔ جو سائنسی سوچوں کے ساتھ میل کھاتا تھا۔ کھاریاں سے میٹرک کے بعد ہمارا گھرانہ اباجان کے پاس کراچی شفٹ ہوگیا۔ اُسوقت کراچی کا تعلیمی لیول پنجاب کے لیول سے کوسوں سال آگے تھا۔ ایک چھوٹے قصبہ سے کراچی جیسے انٹرنیشنل شہر میں آنا ایسے ہی تھا، جیسے کسی کا دوسرا جنم ہوگیا ہو۔ میرے تو چودہ طبق روشن ہوگئے۔ کراچی کینٹ اسٹیشن سے اُترتے ہی، آٹھ دس ٹریک والی ڈرگ روڈ (موجودہ شاہراہ فیصل روڈ) پر ایک دم سے سفر نے ہی، میرے دماغ کو بھی سوچنے کے دس دس ٹریک دے دیے۔ میرا کالج کراچی کے ٹاپ کالجوں میں سے نہیں تھا، مگر وہاں کے سارے پروفیسر اور لیکچرار قابل لوگ تھے۔ سو فیصد اردو سپیکنگ (عرف عام میں مہاجر) لوگ تھے۔ نہایت شائستہ زبان میں بات کرتے تھے۔ میرے لیے تو بہت حیرت انگیز تھا، ایک پنجابی کے لیے جو پڑھا ہی: اوے: والے ماحول میں ہو۔ آپ اندازہ لگائیں ہمارے کالج کے پرنسپل جمیل جالبی صاحب تھے۔ جو پاکستان کے اعلیٰ ترین دانشور اور ادبی انسان اور شاعر تھے۔ ہم سے بھی پہلے کراچی میں رہنے والے بتاتے تھے، کراچی ایک جنت تھا۔ واقعی ہوگا کیونکہ ہمارے زمانہ میں بھی وہ شہر جنت کی مانند تھا، ہمارے بزرگوں کو اس جنت میں کمی ہوتی ہوی نظر آتی تھی، مگر ہمیں نہیں۔ لیکن اب وہ شہر ایک جہنم کا روپ دھار چکا ہے۔ میرے مطابق جہنمی ماحول ہی زمین کی ایک اور یجنل فارم ہوتی ہے۔ اسے انسان اپنی محنت اور تعلیم سے اپنی دھرتی کو جنت میں تبدیل کرتا ہے۔ اور پھر انسانی کوہتایاں، غلطیاں، جہالتیں اس

جنت کو آسانی سے مسمار کر کے جہنم میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ چار سال کالج کے بعد اچانک یورپ جانے کی تمنا نے زور مارا سب کچھ ادھورا چھوڑ چھاڑ کر یورپ کو سدھار لیے اور کراچی یونیورسٹی کے فارم دھرے کے دھرے رہ گئے۔ پانچ سال بعد پھر خاکسار واپس اپنے دیس لوٹ گیا۔ میرے دل میں بہت خواہش تھی کہ میں اپنے پروفیسر صاحب سے ملاقات کروں کوئی مشورہ ہدایات لوں۔ اپنے کالج گیا اُن کا اتہ پتہ لگانے کیلئے۔ وہاں پر مجھے ایک اپنا کالج فیلو مل گیا۔ جو اسی کالج میں نیا نیا لیکچرار لگ چکا تھا۔ اُسنے بتایا پروفیسر امتیاز نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔ اب اُن کی رہائش ڈیفنس میں (سمندر کے پاس) ہے۔ ۱۹۸۴ء میں اُن سے ملنے اُن کے گھر گیا۔ گھنٹی دی ۷ یا ۸ سالہ بچے نے دروازہ کھولا میں نے اُس سے پوچھا کیا سر امتیاز صاحب کا گھر یہی ہے؟ بچے نے کہا وہ میرے نانا ہیں۔ ابھی بات کر ہی رہا تھا، کہ پروفیسر صاحب نے پورا دوازہ کھولا اور مجھے دیکھتے ہی، اونچی آواز میں کہا تم سفیر ہی ہونا؟ میں نے کہا سر تقریباً ۹ سال بعد بھی آپ نے مجھے پہچان لیا۔ جبکہ آپ نے تو ہزاروں شاگردوں کو پڑھایا ہوا ہے، شکلیں کہاں یاد رہتی ہیں۔ سر نے کہا ہاں یہ بات درست ہے مگر چند بچے ذہن میں یاد رہ جاتے ہیں تم اُن میں سے ایک ہو۔ جو پنجابی لطیفے اردو میں سناتا تھا۔ دوسرا یہ کہ میں اتنا بوڑھا بھی نہیں صرف بچوں کے اصرار پر ریٹائر ہوا ہوں۔ کہنے لگے اندر آجاؤ مجھے اپنے گھر میں لے گئے حالانکہ بیٹھک کا باہر کی طرف سے دروازہ بھی تھا (وہی فرینکنس تھی) اپنی بیگم کو کہنے لگے کوئی ٹھنڈا وغیرہ بھیجوا دو۔ میرا شاگرد پنجابی منڈا آیا اے۔ میں نے کہا سر آپ پنجابی بول لیتے ہیں (مذاق میں) کہنے لگے، ملک کے مالک جب پنجابی ہوں تو پنجابی تو سیکھنی پڑے گی نا۔ چند ایک سال لاہور رہا ہوں، جاب کے سلسلہ میں۔ میں نے پوچھا، سر پنجابی لوگوں کو آپ نے کیسا پایا؟ کہنے لگے بہت اچھے کھلے موڈ کے سادہ لوح مذہبی رُجحان کے لوگ ہیں۔ افسوس یہ ہے، کہ پاکستانی پنجابی اپنی زبان کے قاتل ہیں۔ اردو سے ایسا دل لگایا کہ اپنی زبان کی تحریر تک ختم کر دی اور اردو بھی نہ سیکھ سکے۔ کہنے لگے پنجابی زبان میں حد

درجہ کی گہرائی اور وسعت پائی جاتی اس زبان کو مرنا نہیں چاہیے۔ میں نے پوچھا کیا آپکے شاگرد آپ سے ملنے آتے ہیں۔ کہنے لگے ہاں کبھی کھبار کوئی نہ کوئی آجاتا ہے۔ اور مجھے بہت اچھا لگتا ہے کیونکہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ (: مکتب عشق کا دستور نرالا دیکھا اُسکو چُھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا:)
اب دیکھو تم بھی اتنے سالوں بعد مجھے ملنے آئے ہو میرا کوئی نہ کوئی تو سبق تمہیں یاد ہوگا اسی لیے تمہیں چُھٹی نہ مل سکی۔ میں نے کہا سر میں ہر گھڑی ہر بات پر آپکو یاد کرتا ہوں۔ آپ سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ جنت دوزخ کا انوکھا قابل یقین کانسپٹ آجتک یاد ہے۔ آپ کی ترچھے اینگل کی تشریحات دماغ میں آج تک پوست ہیں۔ جو چیزیں کالج کے زمانہ میں سمجھ نہیں پاتے تھے، وہ آپ کا انداز بیان اور لطیف ظرافت کے پہلو سب کو باندھ کر رکھتے تھے۔ عملی زندگی میں وہ سبق جب حقیقت کا روپ دھارتے دیکھائی دیتے ہیں، تو آپ کی یاد آتی ہے۔ سر نے پوچھا تم آجکل کیا کر رہے ہو، یونی ورسٹی وغیرہ گئے۔ میں نے عرض کی سر میں یورپ کے جنون میں مبتلا ہو کر سب ادھورا چھوڑ کر وہاں چلا گیا پانچ سال وہاں رہا، ایک سال ہو گیا ہے واپس آئے ہوئے۔ لگتا ہے اب جنت ادھر ہی بنانے کی کاوش کروں گا۔ پروفیسر صاحب نے کہا ایک تو مجھے یہ سمجھ نہیں آسکی تم پنجابیوں کو باہر بھاگنے کا کیوں بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ اچھا خاصہ یہ ملک ہے، یہاں پڑھو محنت کرو اس ملک کو جہنم سے نکالنے کی مدد کرو۔ میں نے پوچھا کیا آپ نے ادھر جنت بنالی ہے؟ انہوں نے کہا ہاں بالکل میرے ماں باپ انڈیا سے ہجرت کر کے لُٹے پُٹے کراچی آئے تھے۔ ہماری حالت یہ تھی جو پہنا ہوا تھا وہی سب کچھ بچا تھا۔ ہم لوگ کافی عرصہ اسٹیشن کے مسافر خانہ میں رہے پھر عارضی کیمپ لاٹ ہوے میرا باپ علی گھڑ کا پڑھا تھا۔ اُنکو محکمہ بحالیات میں کلرک کی جاب مل گئی ہمارے دماغوں میں یہ بات سما گئی تعلیم ہی جاری رکھنی ہے، یہ ہی ہماری راہ نجات ہے۔ ہمارے ماں باپ نے اپنی اولاد کو تعلیم سے دور نہیں جانے دیا۔ میری ماں نے محلے کے بچوں کو مفت ہی پڑھنا شروع کر دیا۔ اب میرے ۲ بیٹے ۲ بیٹیاں ہیں، ایک بیٹا ڈاکٹر ہے۔

ایک اسلام آباد یونیورسٹی کا پروفیسر ہے، ایک بیٹی بینکر ہے۔ دبئ میں اسکا میاں بھی وہاں کسی بنک میں ہے۔ ایک بیٹی ہمارے ساتھ والے مکان میں رہتی ہے، ادھر ایک گرلز کالج پروفیسر ہے۔ میں نے اپنے بچوں کو کبھی پیسے کمانے کا لالچ نہیں دیا۔ تعلیم کا ہی لالچ دیا ہے، کیونکہ میرا ماننا ہے، جو رزق بذریعہ تعلیم آتا ہے وہی پائیدار ہوتا ہے۔ جو طریقہ ہمارے باپ نے ہمیں دیا، میں نے وہی اولاد کو دیا تھا۔ میں نے اسی بات پر فوکس رکھا۔ میں یقین رکھتا ہوں میں جنت میں رہ رہا ہوں۔ میں نے کہا ملک تو آہستہ آہستہ تباہ ہو رہا ہے۔ کہنے لگے میں نے تو اپنے حصے سے زیادہ کا کام اس ملک کیلئے کیا ہے۔ ہاں البتہ مجھ جیسی سوچ کے بندے ادھر نایاب ہیں۔ وہ مرنے کے بعد کی جنت کے متلاشی یا منتظر ہیں۔ جو کہ اُنہیں کہیں نہیں ملنی۔ میں نے بے اختیار یہ شعر سنا دیا۔

(: لوگوں نے اپنے گھر کو جنت بنالیا اور جنت میں گھر بنانا بھول گئے :)

سر نے بہت بڑا قہقہ لگایا اور کہا، بھئی سفیر بھیا تم سے مل کر مجھے بہت لطف آ رہا ہے۔ لنچ تم نے میرے ساتھ ہی کرنا ہے۔ بہت اصرار کے بعد میں لنچ پر راضی ہو گیا۔ کہنے لگے چلو ساحل سمند پر ٹہلنے چلتے ہیں تم کو کیا جلدی ہے، تمہارے مطابق تو اب تمہارا کراچی میں گھر بار رہا نہیں، اور نہ ہی بیوی بچے ہیں۔ ابے جلدی کہائے کی؟ میں نے پوچھا، سر مشورہ دیں، میں یہاں کیا کر سکتا ہوں اپنی زندگی کو (آپ جیسی نہ سہی) جنت میں ڈھالنے کیلئے۔ سر کہنے لگے تم بنی بنائی جنت کو چھوڑ کر جہنم میں واپس آ گئے ہو۔ زندگی میں ہجرت ایک بار ہی ہو سکتی ہے یا پھر مُشکل سے دو بار۔ مجھے لگتا ہے تم ادھر سے پھر واپس یورپ چلے جاؤ گے اور وہی تمہارے لیے بہتر ہو گا۔ ادھر اب تمہارے لیے کافی مشکلات ہونگی۔ پھر مذاق میں کہنے لگے، ہاں البتہ ایک راستہ ہے، یہاں کی جنت پانے کیلئے میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا، سر وہ کونسا رستہ ہے۔ ہنس کر فرمانے لگے کسی جنت نامی لڑکی سے شادی کر لو، اور پھر ہر وقت جنت جنت چلاتے پھرو گے۔ اب قہقے کی میری باری تھی، جو میں نے بھر پور ادا کی۔

چند دن پیشتر میں نے میڈیکل سائنس کی ایک ڈاکومنٹری دیکھی تب سے مجھے پروفیسر صاحب بہت یاد آئے، اُن کا جنت کے متعلق کانسپٹ بھی یاد آیا۔ ڈاکومنٹری میں یہ تجربات دیکھائے گئے ایک انسان کا مرنے سے چند لمحے پہلے وزن کیا اور مرنے کے فوراً بعد وزن کیا گیا۔ لاش میں ۲۱ ملی گرام کی وزن میں کمی پائی گئی۔ کئی سالوں تک کئی مرنے والے انسانوں کے وزن کو چیک کیا گیا، ہمیشہ ۲۱ ملی گرام کمی پائی گئی۔ سائنس دانوں نے اسکو رُوح سے تشبیہ دی۔ کہ شائید ۲۱ ملی گرام روح ہو؟ مرنے کے بعد انسان میں ۲۱ ملی گرام رُوح پرواز کر جاتی ہو؟۔ پھر جانوروں پر بھی اسی قسم کے تجربات کئے ۱۵ کتوں کے مرنے کا ڈاٹا جمع کیا۔ جو کہ حیران کن طور پر کتوں کی لاشوں میں کوئی وزن کی کمی نہیں پائی گئی۔ انسان نے لاش کو ٹھکانے لگانے کے آج تک (ننانوے فیصد) دو ہی طریقے اختیار کیے ہیں، لاش کو زمین میں دفن کر دینا یا پھر بذریعہ آگ مرنے والے کے جسم کو بھسم کر دینا۔ اور اسکی راکھ کو چھوٹی سی بوتل یا ڈبے میں بند کر کے لواحقین کر دینا، سوائے ۲۱ ملی گرام کے، جسے روح کا نام دیا گیا ہے۔ اب ساری جنت دوزخ کا کانسپٹ ۲۱ ملی گرام پر ہے۔ اب یوں سمجھیں رُوح ایک سافٹ ویر ہے۔ ہارڈ ویر کو تو اس کی فیملی نے زمین میں دبا دیا وہ تو مٹی کی خوراک بن گیا۔ جنوں نے لاش کو آگ لگا دی تھی چند منٹ کے اندر انسانی ہارڈ ویر کو راکھ کر دیا اور ایک جار یا کسی برتن میں بند کر دیا۔ اب مسلۂ ۲۱ ملی گرام کا ہے، روح کسی کے قابو نہیں آسکی۔ جنت کے مزے یا جہنم کی لتر پریڈ اب اُس ۲۱ ملی گرام کو تو دینی ہے، وہ کیسے؟؟ جنت کے مزے لینے کیلئے (۷۲ حوروں کیلئے) جسمانی اعضا ہونا تو ضروری ہوگا۔ یہاں پر ہندو مذہب کا کانسپٹ دوسرے جنم کی تھیوری یا روح کا کسی دوسرے جسم میں سیرایت کرنے کی تھیوری کچھ کچھ میل کھاتی نظر آتی ہے۔ جنت میں جو نقشہ ہمارے ہاں بیان کیا جاتا ہے مردوں کے منہ سے تو رالیں ٹپکتی ہیں، اس دُنیا کی عورتوں کا تو اُدھر کی جنت میں کوئی واضع کام بنتا دیکھائی نہیں دیتا۔ ایسا لگتا ہے عورت ذات مردوں کیلئے صرف اسی دُنیا کے لیے بنی ہیں۔ یہ دُنیا بھی مردوں ہے وہ دُنیا بھی

مردوں کی ہو گی۔ مردوں کے لیے خوبصورت ترین حوروں کا نیا سٹاک موجود ہوگا۔ یہاں کی عورتیں مانیں یا نہ مانیں ادھر کے سارے مذاہب صرف عورتوں کو قابو کرنے کیلئے مردوں کے بنائے لگتے ہیں۔ یہ شک کرنا عورتوں کا حق ہے، ویسے تو مرد کی ہر بات کو شک کی نگاہ سے پرکھتیں ہیں۔ حیران کُن بات یہ ہے کہ تمام مذاہب کے معاملے میں اس جال میں خوشی سے قید دیکھائی دیتی ہیں بغیر شک کیئے۔ یہ مردوں کی سب سے بڑی کامیابی معلوم ہوتی ہے، اتنی ذہین بہادر لمبی عمر پانے والی مخلوق کو کامیابی سے قابو کر کے بے بس کر رکھا ہے۔ باقی تمام جانداروں میں مونث ہی پاور فل اور فیصلہ کُن نظر آتیں ہیں، سوائے انسانوں کے۔ ہر مذہب میں پابندیاں صرف عورتوں پر لگائی گئی ہیں جانبداری کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ نہ تو کوئی عورت ولی اللہ بن سکی، نہ ہی نبی بننے دیا، تمام الہام وہیاں، پیغمبر صالح نبی مرد ہی بنے۔ عورت کو کمتر، کم عقل، بے وفا، وعدہ شکن، نازک مزاج اور بے اعتبار شے بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ تمام نبیوں کے زمانہ میں ایک ایک مرد سو سو عورتوں کا مالک ہوتا تھا۔ بادشاہ، امام یا خلیفہ کی تو بات ہی نہ کریں دولت عثمانیاں کے بادشاہ اسلامی خلفا، یا بادشاہ اپنے حرم میں سینکڑوں عورتیں رکھتے تھے۔ جتنا تاریخ کو کریدتے جائیں گے، رونگٹے کھڑے ہوتے جاہیں گے۔ چلو مان لیتے ہیں ،عورتیں بھی جنت میں جائیں گی، تو وہ کس کے پاس رہیں گی، پہلے خاوندوں کے پاس رہنے کا کہیں تو لکھا نہیں ہوا۔ اگر کسی دوسرے جنتی مرد کے حصہ میں جائیں گی، تو جنت کے باغ میں چہل قدمی کرتے عورت کے پہلے مرد نے دیکھ لیا تو پھر کیا ہوگا؟ اس دُنیا میں مرد نے تو وہ چادر اور چار دیواری اور غیرت کے نام پر قانوں بنا رکھے ہیں، قانون کے باوجود بے شمار لوگ اس بنا پر قتل بھی کر دیتے ہیں۔ ہاں البتہ یہاں کی عورت دوزخ جاسکتی ہے، یہاں کے گنہگاروں کے ساتھ وہاں جو مرضی کرے، کیونکہ وہاں پر غیرت کے کوئی مسلئے مسائل نہیں ہوں گے۔

(: کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملالیں یارب سیر کے واسطے تھوڑی سی جگہ اور سہی :)

خاکسار کوئی مذہبی بحث یا کسی حوالہ جات میں جائے بغیر لکھ رہا ہے کیونکہ ۶۰ ممالک مذہبی حوالہ جات سے چلائے جارہے ہیں ۔ان ملکوں حکام کو معلوم ہے، قوم کو جہنم میں رکھ کر، اگلی جنت کے دلفریب نظارے دکھا کر حکمرانی کرنی ہے۔اندھا یقین سب سے پہلے مذہب کو چاہیے ہوتا ہے، پھر اسکے بعد ہر کام کیا جاسکتا ہے۔انشااللہ، ماشااللہ، ناعضوبلا، جزاکااللہ، الحمدوللہ، استغفراللہ، انالیلہ، اور گناہ سے محفوظ رکھنے والے کئی اورالفاظ کے استعمال کے بعد سوچ اور تحقیق کی بے شمار شاخوں کو بین کر دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ہنسنا یا قہقہ منع ہے، مُسکرانا جائز ہے فتوئے سُننے میں آتے ہیں۔لوگوں کی کی سوچنے کی گراونڈ کو بہت لمیٹڈ کر دیا جاتا ہے۔عام سی بات ہے، کہیں کسی کی موت واقع ہوجائے تو کہنے لگ پڑتے ہیں، اللہ کی یہی مرضی تھی۔پھر یہ بھی کہتے پائے جاتے ہیں۔اچھے بندوں کی اللہ کو بھی ضرورت ہوتی ہے۔بھئی کوئی سوچے اور پوچھے ان کہنے والوں سے، اس طرح آپ کی جان چھوٹ جائے گی کیا؟ اگر اللہ کو اچھے بندوں کی ضرورت تھی اور اگر کائنات کا کاروبار چلانا ہے، تو اچھے بندے اپنے ہاں بھی پیدا کرلیا کرے۔اے خدا تُو تو قادرِ مطلق ہے، ہمارے اچھے بندوں کو ہی کیوں اُٹھا کے لے جارہا ہے زمین پر تو پہلے ہی قحط الرجال ہے، عقل کا گھاٹا ہے، اوپر سے کرپٹ بندے پیدا کر کے اس دھرتی کو جنگ وجدل میں تباہ کر دیا ہے۔ادھر سے کرپٹ بندوں کو بھی اُٹھا لو، اُن کی زندگیاں لمبی اور رنگین کرتا جارہا ہے۔تمہاری غریب مخلوق تم پر آس لگائے بیٹھی ہے۔ادھر بھی دوزخ ہے، ان لوگوں کو ڈر ہے، کہ اُدھر بھی کہیں بے گناہ دوزخ میں نہ ڈال دیے جائیں۔حالانکہ یہ لوگ ڈر کر دن رات بے حساب تیری عبادت بھی کرتے ہیں، جنت کے لالچ میں۔جو حساب کتاب کے لیے بندے ادھر کے ہی لیے جارہا ہے۔ہمیں معلوم ہے، کہ اُن میں سے کئی ادھر سے ڈنڈی مارنا سیکھ چُکے تھے۔ لہذا اس دُنیا کی جنت حاصل کرنے کی دوڑ میں شامل ہونا چاہیے۔ادھر سے کُوچ کر گئے تو سمجھو جنت نہ ملے گی دوبارہ

(: جنت نہ مجھے دی تو دوزخ بھی نہ لوں گا مومن جو نہیں تھا تو میں کافر بھی نہیں تھا:)